رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۰۳۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جب وطن از ملک سلیمان خوشتر | خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر
یوسف کہ بمصر بادشاہی می کرد | می گفت گدا بودن کنعاں خوشتر

کاکوری اخبار

پندرہ روزہ

سالانہ چندہ ۲ | ششماہی ۱ر

جلد ۷ | کاکوری یکشنبہ ۱۶ مارچ سنہ ۴۱ء مطابق ۱۷ صفر المظفر سنہ ۱۳۶۰ھ | نمبر ۲۲

ادبیات

غزل افتخار الشعراء جناب منشی عبدالوحید صاحب نیرنگ کاکوروی

تیغ عریاں تری مجھ تک کہیں آنے پائے
گر گدا کر مرے زخموں کو ہنسانے پائے

پھونک دینگے ترے صحرائے جنوں کو مجنوں
آتش دل سے جو ہم آگ لگانے پائے

ناتوانی سے اٹھے پاؤں نہ مقتل کی طرف
زندگی سے بھی نہ ہم ہاتھ اٹھانے پائے

آ گئے جب مرے قابو میں تو کچھ بس نہ چلا
کوئی حیلہ نہ کوئی بات بنانے پائے

آپ کی شرم نے یہ صلح کرائی مجھ سے
کہ شب وصل میں آنکھیں نہ لڑانے پائے

ناتوانی نے نزاکت نے بڑے ظلم کئے
ہم نہ جانے کبھی پائے نہ وہ آنے پائے

خاک میں مجھ کو محبت نے ملایا نیرنگ
ہم تو آنسو کی طرح سر نہ اٹھانے پائے

موسیقی کا اثر دماغی و جسمانی نشو نما پر

اگر دنیا میں کوئی ایسا محرک موجود ہے جو ہمارے جسم سے باہر رہنے کے باوجود ہمارے جذبات میں تحریک پیدا کرکے زندگی عمل اور حصول مسرت کی تمنا اور استعداد پیدا کر دیا کرتا ہے تو وہ یقیناً موسیقی ہے جس کا تجربہ ہر اس شخص کو ہو چکا ہے جو سماعت سے عاری نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ عوام کا پورا مجمع جو کسی محفل سماع میں موجود ہے اس بات کو محسوس نہ کر سکے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ موسیقی روحانی محبت کے اظہار اور روحانی محبت کے دلنشیں کرنے کا ایک ذریعہ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ روحانی تعشق کا ایک بڑی حد تک نعم البدل ہے۔ وہ حد سے بڑھی ہوئی مسرت جو ہم موسیقی کی بدولت حاصل کرتے ہیں، قریب قریب اسی درجہ پر پہونچ جاتی ہے کہ جو انتہائی لذت یا حظ ہیں اور ہمارے تمام حواسوں کو محبت اور عشق کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر موسیقی کو صحیح طریقہ پر کام میں لایا جائے تو اس سے تندرستی میں ترقی اور کام کرنے کی استعداد کی زیادتی جسم میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سے ایک سچے رفیق تنہائی کا کام لیا جا سکتا ہے اور اسکی مدد سے اخلاق کو مضبوط اور دل کو بلند خیالی کا منبع بنایا جا سکتا ہے۔ (رسالہ ہمدرد صحت دہلی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کاکوری اخبار

نمبر ۲۲ | کاکوری یکشنبہ ۱۶ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء | جلد ۷

قومی نصب العین

گھڑی کتنی ہی قیمتی ہو اگر اُس کا کوئی ایک پُرزہ خراب ہو جائے تو وہ اپنا کام چھوڑ دے گی اور گھڑی بند ہو جائے گی۔ یہ صرف گھڑی ہی پر منحصر نہیں ہے ہر مشینری کا یہی حال ہے۔ جسم انسانی کی کیفیت بھی بالکل مشین کی سی ہے۔ فرض کیجیے کہ انسان کا منھ دیگر اپنا فعل ترک کر دیں تو پورے جسم انسانی کی بنیاد بگڑ جائیگی۔ قومی اور جماعتی زندگی بھی اسی اصول کے تابع ہے۔ یہ خیال کر اگر کوئی ایک یا دو شخص یا زیادہ سے زیادہ ایک فرقہ کسی قومی کام سے علیحدہ رہے گا تو اُس سے کیا نقصان ہے۔ کوئی صحیح خیال نہیں کہا جا سکتا مسلمانوں کے اجتماعی کام سے اگر ایک مسلمان بھی الگ رہتا ہے اور اپنے حصہ کا فرض ادا نہیں کرتا تو اُس سے اُسی قدر نقصان ہوتا ہے جسقدر کہ کسی گھڑی کے ایک پُرزے کے خراب ہو جانے سے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہم اپنی کم نگاہی یا بے توجہی سے اس نقصان کو محسوس نہ کریں۔

کوئی قوم جبتک اُس کے سامنے کوئی نصب العین موجود نہو۔ زندہ قوم نہیں کہی جا سکتی۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اُس پر قوم کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کی قومی اور اجتماعی زندگی میں بجز اس کے کوئی بھی خامی اور خرابی نہیں ہے کہ اُنکے سامنے کوئی نصب العین نہیں ہے جو اُنکی پوری قوم کو ایک دل ہو کر اپنی طرف مائل کرلے۔ چونکہ ہمارے سامنے کوئی ایسا آماجگاہ نہیں جو تمام مسلمانوں کے دلوں اور روحوں کا نشانہ ہو اس واسطے ہم لوگوں کے راستے جُدا جُدا ہو گئے ہیں۔ دل میں برگشتگی پیدا ہو گئی ہے۔ اسلئے قوم میں یکسو ہو کر ایک عالمگیر کام کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے۔ کچھ آدمی مشرق کی طرف جا رہے ہیں اور کچھ جنوب کی طرف راہی ہیں۔ تمام قوم ٹولیوں اور پارٹیوں میں تقسیم ہے اور ہر ایک نے چھوٹے چھوٹے کام جو اُن کے پیش نظر ہے۔ اُس کو قومی نصب العین کا درجہ دے رکھا ہے اور اُسی کو ہر دوسرے اسلامی کام پر ترجیح دیتا۔ اور اُسیں تمام قومی ترقی کا راز مضمر سمجھتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس وقت مسلمانوں کی نگاہ میں کوئی متحدہ قومی نصب العین نہیں جسپر ساری قوم یکدلی اور یکجہتی کے ساتھ عمل پیرا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جماعت نے اپنے فروعی، جزوی، اور مقامی کاموں کو قومی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا ہے اور اس صورت حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ قوم جو کبھی دریا کے دھارے کی طرح ناپیدا کنار طاقتوں کی مالک تھی اب زمین پر چھوٹی چھوٹی نالیاں بنکر رہ گئی ہے جسے ایک تنکے کو بھی بہالے جانے کی قوت نہیں رہی۔ اب وہ وقت ہے کہ مسلمان انانیت اور نفس پرستی کے چکر سے نکلیں اور اپنے جزوی و مقامی کاموں کے ساتھ ساتھ ایسے عالمگیر کام کی جانب بھی متوجہ ہوں جو سارے مسلمانوں کے مل کر کرنیکے ہیں۔ دنیا میں ہر ادنیٰ چیز اعلیٰ کے لئے قربان کر دی جاتی ہے۔ جیسے فرض نماز کا وقت تنگ ہو نوافل ترک کر دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان کو امور عامہ و مصلحت عامہ کے لئے چھوٹے چھوٹے کاموں کو قربان کرنے کے لئے طیار رہنا چاہئے۔ اِس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا کام مسلمانوں کے لئے یہ ہے کہ اپنی تنظیم کامل طور پر کریں اور سچے مسلمان کی شان پیدا کریں۔ اس افراتفری اور گروہ بندی سے ہمارا قصبہ بھی مستثنیٰ نہیں یہاں بھی وہی مرض کار فرما ہے جو تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ مسلمانوں سے عموماً اور اپنے اہل وطن سے خصوصاً پُرزور الفاظ میں اپیل کرتے ہیں کہ وہ ڈھیرہ بندی اور گروہ بندی کی لعنت سے آزاد ہونے کی کوشش کریں اور سب اہل قصبہ ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں اور دوئی کو دو پارہ پارہ کر دیں۔

قصبہ کے ایک محترم بزرگ (قاضی انتظار علی خان عباسی) نے یہاں سیرت کمیٹی قائم کرنے کی بنا ڈالی اور اپنی جیب سے معقول رقم خرچ کرکے سال میں دو تین جلسے بھی منعقد کیئے لیکن اس مفید اور مذہبی ادارہ میں ہمارے اہل وطن نے کہاں تک دلچسپی لی اور اس کی رکنیت قبول کی ہم کو کہتے ہوئے شرم آتی ہے خصوصاً اُن مشین اور برگزیدہ ہستیوں سے تعجب معلوم ہوتا ہے جن کو مذہبی غلو بھی ہے۔ ہمکو معلوم ہے کہ اس تین سال کے عرصہ میں قاضی صاحب موصوف کی جد وجہد سے ایک درجن سے زیادہ ممبر نہیں بن سکے درانحالیکہ چندہ رکنیت بہت معمولی ہے جو ایک چھوٹی حیثیت کے شخص کے لئے بھی گراں نہیں ہو سکتا۔ اس پر بھی لوگ متوجہ نہیں ہوتے۔ ہمارے خیال میں یہ مفید اور کارآمد ادارہ بھی اُسی ڈیرہ بندی کا شکار ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں قصبہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ بقول ہم عصر "ایمان" "کہ امت مسلمہ کے لئے اب وقت ایسا ہے کہ مسلمان قرآن کے احکام پر چلیں، سیرت رسولؐ کے سانچے میں ڈھل جائیں اور پانچ ارکان اسلام کی حکمتوں کو سمجھ کر اُن پر قائم ہو جائیں تاکہ وہ اس دنیا میں پھر ایکدفعہ خدا کی خلافت اور اسلام کی بادشاہت کا تخت بچھا سکیں۔" آؤ! ہم سب مل جائیں اور اس کو کامیاب بنانے میں ایک دل ہو کر ساعی ہوں۔ اہل عزم اور اہل عمل کہاں ہیں۔ آئیں اور قاضی صاحب کا ہاتھ بٹائیں۔

چند بچھڑے ہوئے ادیبوں کی یاد!!!

(از منشی حسن ابن ضیا علوی صاحب ضیا کاکوروی)

ہمارا قصبہ کاکوری جس سرزمین پر قائم ہے قدرت نے اس کے بنانے میں بڑی رعنائی اور فیاضی سے کام لیا ہے

ہر عہد اور ہر زمانے میں اس نے اپنی جواہر ریز گوہر ریز سرزمین سے ایسے ایسے لعل و گوہر اگلے ہیں جنھوں نے نہ صرف وطن ہی کی تاریک گلیوں کو روشن کیا بلکہ وطن سے باہر ہندوستان کے مختلف گوشوں کے علاوہ، محلوں، کلبوں، تفریح گاہوں، مدرسوں اور خانقاہوں کو جگمگایا ہے اور آج بھی اس گئے گذرے زمانے میں جب علم و عمل کی کمی ہے، دولت و ثروت کے بجائے افلاس و غربت کا دور دورہ ہے اس وقت بھی اگر کوئی برادرِ وطن گدڑی میں لعل کے مصداق جگمگا اُٹھتا ہے تو بڑے بڑے روشن ضمیروں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مصیبت کے دور میں دولت و امارت کے افسانوں کو مبالغہ سے علیحدہ کرکے آنے والی نسلوں کے سامنے پیش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے لیے ان بابرکات بزرگوں کے حالات شمع ہدایت کا کام نہ دیں۔

آج کی صحبت میں ارادہ ہے کہ ہم چند بچھڑے ہوئے محترم بزرگوں کے حالات آپ کو سنائیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ حالات آپ کو معلوم نہیں ہیں لیکن مقصد یہ ضرور ہے کہ جس نقطہ نظر سے ان حالات کو پیش کرنا ہے اُس کا اندازہ ممکن ہے بہتوں کو نہ ہو۔ لیکن اس طرح پر اُن محترم بزرگوں کی یاد پھر تازہ ہو جائے گی اور ہم کوشش کر سکیں گے کہ اُن کے قدم بقدم چل کر اتنا نہ سہی تو کچھ کم درجہ ہی حاصل کریں اور اُن بزرگوں کے صحیح جانشین ثابت ہو کر کاکوری کے نام کی روایات کو قائم رکھیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اسی سلسلہ میں میرے محترم بزرگ دبرادرانِ وطن توجہ کرکے کاکوری کے اور دیگر ادیبوں کے حالات سے ہمیں اُن کے یاد رکھنے میں مدد دینگے اور یہ سلسلہ جو میں نے چھیڑا ہے وہ بند نہ ہونے پائیگا چونکہ کاکوری اخبار کا تعلق کاکوری ہی سے ہے اس لئے کاکوری کے اُن ادیبوں کا جو ادب کا درخشاں ستارہ بنکر آسمان ادب پر چمکے اسمیں ذکر کرنا زیادہ مناسب ہے بجائے اور دوسرے غیر متعلق مضامین سے اخبار کے صفحات کو بھرنے سے۔ جذبات سے مجبور ہو کر بطور تمہید عرض کیا گیا ہے، اچھا تو سنئے:۔

(۱) منشی احمد علی علوی مرحوم، بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی، پہلے ہم اُن ادیب کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے "لکھنؤ کے شباب" کی داستان بڑے مزے لے لے کر بیان کی ہے جس پر اخبار اُش

نے عمدہ رائیں لکھیں۔ آپ نے اُردو و فارسی کی قابلیت کے ساتھ ہی ساتھ صرف انگریزی میں بھی قابلیت نہیں پیدا کی بلکہ قانون پر بھی عبور حاصل کیا۔ موصوف منشی مومن علی خاں مغفورؔ مرحوم کے پوتے تھے سنہ ۱۲۸۶ھ میں ۱۵ رمضان کو پیدا ہوئے عربی و فارسی کی متوسطات تک تعلیم حضرت حافظ شاہ علی انور قلندرؒ سے حاصل کی افسوس عمر نے وفا نہ کی اور چالیس سال کے سن میں سنہ ۱۳۲۶ھ میں ۱۰ر جمادی الاولیٰ کو مرض ہیضہ میں بمقام بارہ بنکی جہاں مرحوم وکالت کرتے تھے انتقال کیا اور اپنے خاندانی قبرستان رسولی باغ کاکوری میں سپرد خاک ہوئے۔ منشی احمد علی مرحوم اگر زندہ رہتے تو آج اُنکی وکالت کی دھوم ہوتی۔ (کیونکہ شروع ہی میں وکالت بہت کافی چمک چکی تھی) اور ہماری اُردو زبان و ادب ایک ایسے بے نظیر اور بے بدل ادیب کے برکات اور رشاحت قلم سے محروم نہ رہ جاتی۔ انکی دلچسپیاں اُنکا ادبی ذوق بہت ہی بڑھا چڑھا تھا۔ انکی ذہانت کا عجیب عالم تھا بڑکلے کی مکمل ضخیم کتاب "تاریخ تمدن" کا ترجمہ آپ ہی کے قلم سے نکلا اور پھر ایسا کہ ہر طبقہ میں کافی مقبول ہوا۔

(۲) منشی واحد علی علوی بسملؔ کاکوروی۔ پیدائش سنہ ۱۲۸۱ھ آپ نے شاعری میں خاقانی ہند ادیب الشعرا منشی امیر احمد مینائی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا عرصہ تک ریاست بھوپال و حیدرآباد کی ملازمتوں میں منسلک رہنے کے بعد لکھنؤ میں رہ کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرنا شروع کی۔ حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے مخصوص مریدوں میں سے تھے۔ تعلیم عربی و فارسی کی آستانۂ عالیہ کاظمیہ پر حضرت حافظ شاہ علی انور قلندرؒ سے حاصل کی تھی۔ ظاہر ہے وہ آستانوں کا تربیت یافتہ دنیا میں کس طرح خالی اور محروم رہتا۔ دل سوز و گداز سے پُر تھا۔ مرشد کامل کی نگاہ نے دل کو بسمل بنا دیا اور اسی تخلص سے مشہور ہوئے نفاست مزاج میں بہت تھی اور ذہانت کا عجب عالم تھا۔ خوش پوش اور جامہ زیب انسان تھے اپنے پرائے جس سے بھی ملتے خلوص، محبت، رحم و ہمدردی کی بارش شروع ہو جاتی۔ منتظم اس قدر زبردست تھے کہ تھوڑے میں بھی ایسے خوش سلیقگی سے بسر کرتے کہ تعجب ہوتا تھا۔ عرصہ تک گلچین کی ایڈیٹری بھی کی۔ منشی واحد علی بسملؔ دبستان غزل کے بہت ہی وفاشعار پیرو تھے اُنکے موضوع وہی ہوتے تھے جو عام طور سے اُردو شاعر استعمال کرتے آئے ہیں لیکن وہ اسالیب میں یکتا اور بے مثل تھے یہی وجہ ہے کہ آج بھی انکی شاعری کو مقبولیت حاصل ہے جیسی کہ آج سے ایک ربع صدی پہلے انکے استاد امیر مینائی کے شعر میں تھی۔ افسوس یہ ہے کہ اب رنگ سخن ہی بدل گیا ہے جبکہ انکے استاد ہی کی شاعری ٹکسال باہر تصور کی جاتی ہے تو انکی شاعری کے متعلق کسی رسمی معذرت کی ضرورت نہیں۔ بسملؔ کا ابتدائی کلام ایک بڑی حد تک اپنے استاد امیر مینائی کی طرح ناسخؔ کے رنگ میں ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ نہ تو تمثیل شاعری خشک ہونے پائی اور نہ تصنع سے شاعری بے کیف ہوئی۔ تکلف میں بسملؔ نے ایک ایسی لطافت اور رنگینی بھر دی ہے کہ نزاکت اور لوچ کے علاوہ ایک خاص مزا پیدا ہو گیا۔ جو انکے کلام کو دوسروں کی ایسی شاعری سے بہت زیادہ دلکش اور پر لطف بنا دیتا ہے اُنکے کلام میں فصاحت اور ترنم نمایاں ہے۔ شوخی کلام لطف کو دوبالا کر دیتی ہے لیکن متانت قائم رہتی ہے۔ صحت زبان اور روزمرہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پائے یہ ضرور ہے کہ شوخی کبھی کبھی متانت کے جامہ سے پھوٹ کر نکل آتی ہے لیکن جب اُس زمانے کے رنگ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ عیب کچھ زیادہ تکلیف دہ نہیں معلوم ہوتا۔ اُنکا کلام عام طور سے صاف اور سلیس ہے بول چال اور محاورات کے لحاظ سے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے۔ تصوف کی جھلک اُنکے کلام میں وسیع النظری کا ثبوت ہے گر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انکا کلام ایک بڑی حد تک سرمستیوں کی کہانی کا ذخیرہ ہے جو ممکن ہے کہ موجودہ روشنی والوں کو ناپسند ہو لیکن اُس زمانہ میں دل کی شگفتگی جذبات کی بقا کیلئے ایک حد تک ضروری سمجھا گیا۔ افسوس عمر نے وفا نہ کی ورنہ نہیں معلوم شاعر کا دماغ کن کن گہرائیوں کا مطالعہ کرتا اور نہ جانے اُنکا پرواز تخیل کہاں کہاں

پہونچا افسوس بروز جمعہ ۱۲ر جمادی الآخر ۱۳۵۵ھ کو مرض فالج میں انتقال کیا اور حضرت شاہ صبغت اللہؒ کے احاطہ میں بمقام کاکوری حسب وصیت ہمیشہ ہمیشہ کی نیند جا سوئے نمونہ کلام ملاحظہ ہو

صبح سے بیٹھ گئے بام پہ وہ روک کے راہ　　دوپہر ہوگئی سورج کو نکلنے نہ دیا
عاشق ابرو کو مارا سرمہ کے دنبالہ سے　　نیچہ سے کام قاتل نے لیا تلوار کا

جناب قبلہ خانبہادر منشی اطہر علی علوی مرحوم کی وفات جب مدینہ منورہ میں ہوئی اور وہیں دفن ہوئے تو حضرت بسملؔ کے منھ مبارک سے یہ شعر بے ساختہ اور فی البدیہہ نکلا۔ دیکھئے کسقدر بلند اور معنی خیز ہے ؎

چھوڑ دنیائے دنی کو اطہرؔ منزل صدق و صفا تک پہنچے
بارگاہ نبوی سے ایسی آبرو پائی خدا تک پہنچے

افسوس زمانہ نے مہلت نہ دی اور ہم اس پیام سے محروم ہوگئے جسکے سنانے کی شاعر تیاری کر رہے تھے! ع،

لے بسا آرزو کہ خاک شدہ !!!

(۳) منشی ڈپٹی امیر حسن صدیقی مرحوم، ہمارے قصبہ کے ایک اور بابرکت بزرگ کا ذکر ہے جن کا تعلق مخدوم شیخ قیام الدین کے خاندان سے تھا۔ ہنگامہ مشرق میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور کلرکی سے ڈپٹی کلکٹری تک ترقی کر کے پنشن پائی۔ ابتدا میں انھوں نے ادب کی چاشنی اودھ اخبار میں مضمون نگاری کر کے حاصل کی۔ ریاست چرکھاری کی تاریخ کا ترجمہ کیا۔ کتاب العرف عربی میں لکھی۔ "شب جو بھیلکھنڈ" انکا مشہور ناول ہے۔ انگریزی ناول نگار رنالڈ کی مشہور ناولوں کا ترجمہ کیا۔ گورنمنٹ نے ایک ترجمہ پر انعام بھی دیا۔ علم الانساب میں کافی دخل تھا۔ تمام عمر لکھنے پڑھنے میں صرف کی کوئی وقت رائگاں نہ کیا آج بھی انکی یادگار وہ بلند تصانیف ہیں جو نولکشور پریس سے حاصل سکتی ہیں۔ وضع داری یہ تھی کہ نولکشور کے مطبع سے جو تعلق اول سے تھا آخر تک اُسے نباہ دیا اُنکے دادا پروفیسر عبدالواحد ان چند علماء میں تھے کہ مسکناٹن ایسا مشہور مشاہیر مصنف، کرنل بیلی اور مسٹر بارلو اُنکے شاگرد تھے اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جان گلکرسٹ نے آپ کو بُلا کر ملازم رکھا۔ افسوس ہے کہ مرحوم کوئی ادبی جانشین صحیح معنوں میں نہ چھوڑا جو اس علم و کمال کی شاخ کو قائم رکھتا اور سعدی کی یادگار قائم ہو سکتی۔

(۴) محسن علی علوی کاکوروی منشی نولکشور کے مطبع سے تعلق رکھنے والوں میں جہاں مولانا عبدالمجید سحرؔ کاکوروی کا نام مشہور ہے اُسی طرح دور آخر میں مولوی محسن علی مرحوم بھی بہت مشہور ہیں۔ تمام عمر مطبع کا کام و کالت کے کام سے فرصت پا کر کرنے میں گذار دی۔ تصنیف و تالیف اُنکا مشغلہ لطیف تھا۔ انکسار یہ تھا کہ عرصہ تک لوگوں کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مطبع سے جو کتابیں نکلتی ہیں اُنمیں مولوی محسن علی کا بھی ہاتھ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اس گمنامی میں صرف اُنکی یادگار چند ناول (جسمیں معشوقۂ فرنگ بہت مشہور و مقبول ہوئی) ہیں۔ کبھی بھی بیکار نہیں رہے۔ پیروں سے معذوری کے بعد بھی چیف کورٹ لکھنؤ میں بطور مترجم کام کرتے رہے۔ ہمیشہ علمی شغل میں وقت گذارا۔ جہانتک ترجمہ کا تعلق ہے وہ اس فن کے ماہر تھے اور اسی وجہ سے اُنکی خدمات کو اُردو ادب کی دنیا میں بھلایا نہیں جا سکتا۔ اکثر جن لوگوں کو ترجمہ میں دقت ہوتی آپ ہی سے رجوع کرتے، حافظہ کا یہ عالم تھا کہ آدھی سے زیادہ انگریزی ڈکشنری یاد تھی۔ نہایت سمجھدار اور ذہین انسان تھے مشکل سے مشکل بات جلد سمجھ لیتے اور ہمیشہ اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتے لیکن باوجود علمی قابلیت کے مولوی صاحب نے افسوس ہے کہ تصنیف کی طرف توجہ نہیں کی آپ کی جو کچھ یادگار ہیں وہ ناولوں کے ترجمہ ہیں جو نولکشور پریس میں چھپے ہیں، اسمیں شک نہیں کہ وہ ترجمے بھی بذات خود کسی تصنیف سے کم نہیں۔ اُردو زبان پر عبور پوری طرح حاصل تھا۔ سلاست اور روانی اور ہر لفظ موقع و محل سے استعمال کرنا آپ کے اسلوب کی خاص خصوصیت تھی۔ اصطلاحات کے ترجمے کرنے میں کمال تھا۔ آپکی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جہانتک ہو سکے انگریزی الفاظ ترجمہ میں نہ آنے پائیں اُردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ اسقدر جلد دبستان ادب سے امام المترجمین اُٹھ گیا۔

(۵) منشی ارتضا علی شررؔ کاکوروی مرحوم شعر و سخن میں نواب

مرزا خاں داغ دہلوی کے شاگرد تھے اور ایسے شاگرد جن پر استاد کو بھی ناز تھا۔ فطرتی ذہانت۔ طباعی اور نازک خیالی نے کلام میں عجب لطف پیدا کر دیا تھا۔ اشعار فی البدیہہ کہتے اور زبان کی شیرینی سے اسمیں لطافت پیدا کر دیتے۔ تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اُنکے کلام پر نظر ڈالنے سے چند باتیں صاف نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز زبان کی صفائی اور روانی ہے ثقیل الفاظ اور فارسی ترکیبوں سے انھوں نے بڑی حد تک گریز کیا ہے پیچ در پیچ استعارے اور بعید از کار خیالات نہیں پائے جاتے۔ درد بھرے الفاظ میں ماجرائے عشق بیان کرنا انکی شاعری کا نصب العین رہا۔ عشق کی شدت و انتہائی کیفیت کو بڑے مزے کے ساتھ معمولی الفاظ میں بیان کر دینا اُنکا معمولی جوہر تھا۔ ثقیل الفاظ و ترکیبوں سے پرہیز کرتے مگر فارسی کی پرانی ترکیبیں اور دلکش الفاظ کے استعمال سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ چنانچہ تا بہ زندان جفا۔ نظر فریبی۔ درد جگر وغیرہ سے اکثر اپنے کلام کو آراستہ کرتے۔ اسی وجہ سے تغزل اور مزہ انکے کلام کے دل و جان ہیں۔ محاورات کے صرف میں ان کو پورا عبور تھا جہاں کہیں استعمال کرتے تھے ایک خاص خوبی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کو چاہے آپ قدما کی تقلید کہیے یا الفاظ کی دلکشی کہ معشوق کو "مری جان" اور "صنم" کہہ کر یاد کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ افسانہ طول ہوا جاتا ہو مگر کیا کروں کہ مرحوم کے کلام کے خصوصیات یکے بعد دیگرے اس طرح ذہن میں چلے آتے ہیں کہ باوجود اختصار کے پھر بھی ختم کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ بے مثل شاعر ہونیکے علاوہ ترجمہ کرنے میں بھی یکتا تھے چنانچہ اڈیسن کے مضامین کا ترجمہ کیا تھا۔ موصوف جدید شاعرانہ تحریکات سے متاثر تھے۔ چنانچہ اُنکی نظمیں "باسی ہار" وغیرہ مقبول خلائق ہوئیں۔ تصانیف میں ارمغان اودھ۔ ارمغان احباب۔ تصویر عبرت۔ خیاباں وغیرہ طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ داغ کے علاوہ دو چار غزلیں جلال لکھنوی اور دس بیس حضرت امیر مینائی نے بھی دیکھی تھیں۔ سیتاپور میں بعارضہ ہیضہ ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۰ اگست سنہ ۱۹۲۱ء کو رحلت کی اور متصل عیدگاہ شہنشاہ

سخن ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میٹھی نیند جا سوئے۔ چند اشعار بطور نمونۂ کلام پیش کئے جاتے ہیں ؎

ابتدا عشق و محبت کی بلا ہوتی ہے ‏ ‏ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوتی ہے

پھر کہاں ہیں اگر وصل کا وعدہ ہو قریب ‏ ‏ اس سے تو اور طپش دل میں سوا ہوتی ہے

یہ وقت نزع ہے مختار ہو نہ آنیکے ‏ ‏ مگر اتنا کہے دیتے ہیں دم نکلیگا مشکل سے

(۶) آخر میں مجھے منشی اعجاز حسین علوی اعجاز کاکوروی کا ذکر کرنا ہے۔ سنہ ۱۲۹۵ھ میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم آستانۂ کاظمیہ پر حاصل کی۔ شعر گوئی کا لڑکپن سے شوق تھا۔ عرصہ سے حیدرآباد میں سب رجسٹرار تھے۔ انکی مثنوی "یادِ وطن" صحیح معنوں میں درد و غم کے جذبات سے لبریز تھی اور اہل وطن میں عزت حاصل کر چکی تھی۔ ارباب کمال کی عزت افزائی فرمایا کرتے تھے دو سال سے اورنگ آباد میں قیام تھا اور عاشقانہ شاعری کو چھوڑ کر نعت کی طرف توجہ زیادہ تھی اس دور کا کلام زیادہ پُر اثر ہے۔ اشہب طبع شاعری کے میدان میں رواں ہے۔ غزل۔ قصیدہ۔ نعت وغیرہ پر نہایت کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے افسوس ہے کہ آپکا بیشتر کلام ابھی تک باوجود احباب کے اصرار و تقاضے کے محض آپکے انکسار کے باعث طبع نہ ہو سکا۔ اُنکے لڑکپن کے ساتھیوں میں منشی امیر احمد صاحب علوی اگر انکی سوانح حیات اُنکے دیوان کے ساتھ مرتب کرینگے اور انکی شاعرانہ سحر کاریوں پر تبصرہ کرینگے تو وہ عجیب چیز ہوگی۔ آپکے کلام میں عموماً جذبات عشق میں شدت اور اسکے ساتھ تاثیر۔ سوز و گداز کی فراوانی ہے۔ وسیع النظری کا یہ عالم ہے کہ ہر شئے کائنات کی شراب عشق سے لبریز نظر آتی ہے گویا دنیا کا کوئی ایسا ذرہ نہیں جو کیف آور نہ ہو اسی وجہ سے کلام میں تصوف کی چاشنی ہے۔ طبیعت کے مختلف جوہر اشعار میں اپنا رنگ دکھاتے ہیں۔ کہیں معاملات عشق کی نازک باتیں ہیں کہیں انداز گفتگو کے خوشگوار پہلو۔ کہیں مضمون آفرینی ہے کہیں خیالات کی بلندی۔ کہیں قوت بیانیہ پر یہ قدرت کہ نازک سی نازک بات کو دو لفظوں میں سمجھا دیتے ہیں کہیں انداز بیان کی یہ صورت ہے کہ دو سیج سے

وسیع مفہوم کو اختصار کا جامہ پہنا دیا۔ غرضکہ آپکا کلام خود آپکی قادر الکلامی کا آئینہ ہے۔ واردات قلبی کا بیان کچھ اس انداز سے کیا کہ گویا اپنے اوپر بھی وہی حالت گذر رہی ہے۔ آپکے طرز بیان میں ایک خاص دلکشی پائی جاتی ہے۔ الفاظ کے انتخاب، محاورات کے برمحل صرف، فارسی تراکیب کی دلآویز آمیزش، بندش کی چستی، صفائی اور روانی نے کل شاعری میں ایک خاص مزہ پیدا کر دیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اعجاز نے اپنا کوئی صحیح جانشین نہ چھوڑا اور ۲۶ اگست سنہ ۱۹۱۴ء کو صبح ۵ بجے ہمارے وطن کا یہ جوہر اعظم شہنشاہ سیم سخن دری وطن سے باہر دور دکن کی خاموش وادیوں میں محو خواب ہو گیا!!۔

چونکہ آپکے کلام کا زیادہ حصہ غیر مطبوعہ ہے جو ہر شخص کو آسانی سے نہیں مل سکتا اسلئے نہایت اختصار کے ساتھ صرف غزلیات سے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

مہماں ہے وہ دم بھر کا آنا ہو تو آ جاؤ
بیمار محبت کو دیدار دکھا جاؤ

عشاق کی نظروں میں وہ طور ہے موسیٰ کا
جس آنکھ میں تم آؤ جس دل میں سما جاؤ

ہم خاک ہوئے کب کے اب رونے سے کیا حاصل
آئے ہو جو تربت پر دو پھول چڑھا جاؤ

اس مختصر تذکرے میں اختصار کا پہلو ادیبوں کے حالات پر سرسری نظر ڈالتے وقت اور تنقید کلام کے موقع پر بھی مدنظر رہا ہے۔ ہر جگہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو جائے لیکن بات کو بڑھایا بھی نہ جائے اگر ممکن ہو تو بارہ کو جملہ میں اور جملہ کو چند لفظوں میں پُرمعنی طریقہ سے بیان کر دیا جائے برا یا بھلا جو بھی ہے حاضر ہے۔ امید ہے اس سلسلہ کو ارباب وطن جاری رکھکر بزرگوں کی یاد کو تازہ کرانے کی کوشش ضرور کریں گے!!!

وطن کی خبریں

نوٹ:۔ اعزہ احباب اور جملہ اہل وطن سے جو باہر ہیں خواہ وطن میں گذارش ہے کہ اپنے یہاں کی قابل اندراج خبریں اور اطلاعات دفتر میں روانہ کر کے مشکور کرتے رہیں۔ (اڈیٹر)

تصحیح۔ گذشتہ اشاعت میں خانصاحب مولوی احسام الدین صاحب کی غزل کے مقطع کے دوسرے مصرعہ میں بجائے "سے" "کے" "نے" کتابت کی غلطی سے چھپ گیا ناظرین درست فرمالیں۔ صحیح مصرعہ یوں ہے۔ "کمبخت سے تباہ کئے جا رہا ہوں میں"

موسم:۔ خوشگوار ہے۔ ادھر دو تین روز تمام دن رات کو بھی ہوا تیز و خنک چلی اور کچھ سردی بڑھ گئی تھی۔ دنکو دھوپ میں گرمی کافی ہونے لگی ہے اور دھوپ میں تیزی بڑھ رہی ہے۔ اُدھر دو تین دن شب کو گرمی ہونے سے جو لوگ کمروں سے کھلے دالانوں میں سونے لگے تھے اور ہلکی رضائی اوڑھنا شروع کر دی تھی اُنکو گو بادل ناخواستہ پھر کمروں میں واپس جانا پڑا یا لحاف اوڑھنے لگے ہیں یہ کیفیت عارضی ہے موسم تیزی سے بدل رہا ہے۔ آم کے باغات میں بور خوب آیا ہے خصوصاً قلمی باغوں کے درخت خوب بورے ہیں تخمی باغوں میں نسبتاً بور کم معلوم ہوتا ہے۔ اگر آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہا تو انشاءاللہ اس بار فصل انبہ خوب ہوگی۔

آب و ہوا:۔ ابھی سے کوئی خاص شکایت نہیں سنی گئی۔ تداخل فصلین کی وجہ سے لوگوں کو نزلہ و زکام کی شکایات ہونا سُنا گیا ہے۔

مردم شماری:۔ سُنا گیا ہے کہ حال کی مردم شماری میں سنہ ۱۹۲۱ء کے مقابلہ میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ گورنمنٹ کے اعلان کے بعد انشاءاللہ ہم پوری تفصیل قصبہ کے مردم شماری کی شائع کر سکیں گے۔

ہولی:۔ ۱۳ مارچ سنہ ۳۱ء کو ہندو برادران وطن نے اپنا تہوار ہولی منایا۔ ۱۲ و ۱۳ مارچ سنہ ۳۱ء کی درمیانی شب میں ہولی میں آگ دی گئی اور دوسرے دن (۱۳ مارچ) دھولنڈی یعنی رنگ بازی ہوئی۔ مختلف ٹولیاں گاتی بجاتی رنگ کھیلتی راستوں اور سڑکوں سے گذریں۔ سہ پہر سے رات گئے تک عوام خواص

صاف ستھرے اور زرق برق لباسوں میں ملبوس ہوکر اعزہ اور احباب سے ملنے آتے جاتے رہے اور رات کو عوام میں خوب گانا بجانا ہوا۔ نہایت خوشی و انبساط کے ساتھ ہولی کا تہوار قصبہ میں منایا گیا۔ اور ہندو بھائیوں کا یہ تہوار بخیر و خوبی گزرا۔

قصبہ میں جوئے کی کثرت:۔ شکایتیں سُنی جا رہی ہیں کہ قصبہ کے اندر متعدد جوئے کے اڈے قائم ہیں اور روز آنہ دن اور رات میں کثیر تعداد میں جواریوں کا مجمع ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ اہلکاران پولیس کو جلد اس طرف متوجہ ہوکر جوئے کا انسداد کرنا چاہئے ساتھ ہی پبلک کو بھی جواریوں کے گرفتار کرانے میں پولیس کی امداد کرنا ضروری ہے۔

صحت و تندرستی:۔ (۱) حاجی مولوی انوار الحسن صاحب کا مزاج گذشتہ دورہ کے بعد چاق ہوگیا تھا اور موصوف لکھنؤ سے واپس آگئے تھے کہ گذشتہ ہفتہ میں پھر بے خوابی کا دورہ ہوا اور تمام رات نیند نہ آنے سے طبیعت پھر سست ہوگئی تھی۔ رمضان کے بعد ایکماہ کے اندر اسقدر جلد دو دورہ نے کسیقدر اضمحلال بڑھا گیا۔ دواؤں کے استعمال سے اب طبیعت چاق ہے اور شب کو نیند کافی آجاتی ہے (۲) محسن شاہ صاحب (چودھری محلہ) اب بفضلہ اچھے ہیں شکایات میں بڑی حد تک کمی ہے' بخار بھی اب نہیں ہے البتہ ابھی ضعف ہے جو انشاء اللہ بتدریج رفع ہو جائے گا۔ م

علالتیں:۔ (۱) منشی ظہیر احمد علوی (محلہ باولی) کے متعلق دریافت ہوا ہے کہ سلطانپور میں شدید درد قولنج میں مبتلا ہوگئے تھے۔ کئی دن نہایت کرب و بے چینی سے گذرے۔ پہلے سلطانپور میں علاج ہوتا رہا جب وہاں کوئی افاقہ نہوا تو منشی وزیر احمد علوی (برادر بزرگ) جو علالت کی خبر سنکر سلطانپور گئے تھے لکھنؤ لے آئے ہیں۔ لکھنؤ میں اولاً ڈاکٹری علاج شروع ہوا اور انجکشن دیئے گئے لیکن سکون درد میں نہیں ہوا۔ یونانی علاج سے درد کی تکلیف میں کمی ہے۔ (۲) والدۂ مولوی حنیف الرحمٰن علوی (مولوی محلہ) کو گذشتہ ہفتہ میں شدید قلبی دورہ ہوا تھا۔

(۳) اہلیہ مولوی مقبول الدین صاحب (مولوی محلہ) کی حالت روز بروز نازک تر ہوتی جاتی ہے۔ کئی زخم حلق سے لیکر منھ تک ہوگئے ہیں۔ ضعف حد سے سوا ہے غذا رقیق شکل میں جو کچھ بھی بذریعہ ٹیوب دی جاتی ہے حلق سے اُسکے اُترنے میں بھی کچھ تکلیف ہوتی ہے گمان ہوتا ہے کہ زخموں کا سلسلہ حلق تک پہونچ گیا ہے اور تمام زخم ایکدوسرے سے ملگئے ہیں۔ حرارت برابر رہتی ہے اور کچھ کھانسی کی بھی شکایت پیدا ہوگئی ہے۔ اللہ جل شانہٗ رحم فرمائے اور مریضہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔

(۴) اہلیہ مولوی اسلام الدین علوی (مولوی محلہ) کی حالت بمقابلہ پہلے کے روباصلاح بیان کیجاتی ہے۔ بخار میں کچھ کمی ہے البتہ ضعف ابھی بہت ہے کہ بلا اعانت نقل و حرکت میں مشکل ہوتی ہے۔ سُنا ہے اس عرصہ میں پسینہ کم نکلا جو کمزوری کا اور بھی باعث ہوتا تھا۔ تا وقتیکہ طبیعت بالکل اصلاح پر نہ آجائے مریضہ کی حالت قابل اطمینان نہیں کہی جاسکتی۔ اللہ تعالےٰ اجلد صحت عطا فرمائے۔

(۵) کلکتہ سے   اطلاع ملی ہے کہ قاضی اختطار علیخانصاحب کے ناک میں کچھ شکایت پیدا ہوگئی ہے جسکی وجہ سے اُنکو تکلیف ہے اور اُنکی بھاوج صاحبہ (بیوہ قاضی اعجاز علیخاں مرحوم) کا مزاج بھی ناردست ہے خداوند کریم ہر دو صاحبان کی جملہ شکایات رفع فرماکر صحتیاب و تندرست فرمائے۔

(۶) والدۂ مولوی خلیل احمد عباسی کی طبیعت اسطرف برابر خراب رہی ہلکے اور سخت کئی دورے ہوئے ضعف کافی ہوگیا ہے۔ اب حکیم عبد المجید (جھوائی ٹولہ لکھنؤ) سے رجوع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس علاج سے صحت کاملہ عطا فرمائے۔ م

متفرقات:۔ (۱) دریافت ہوا کہ حاجی محمد حسن علوی کا چھوٹا لڑکا لکھنؤ میں سڑک پر کھیل رہا تھا کہ ایک گذرنے والی موٹر کے زد میں آگیا اور سڑک پر گر پڑا۔ شکر ہے چوٹ زیادہ نہیں آئی صرف دو تین جگہ خراش آگئی تھی۔ فوراً طبی امداد ہو گئی اور زخموں کی مرہم پٹی کردی گئی۔

(۲) سُنا ہے شیخ محمد ایوب صاحب علوی تحصیلدار ریاست محمود آباد بحصول رخصت گذشتہ ہفتہ میں بسواں سے وطن آئے تھے اور ۴-۵ دن قیام کے بعد اپنے مستقر پر واپس گئے۔

سید محمد منیر الدین نے یونائیٹڈ انڈیا برقی پریس' لکھنؤ میں باہتمام سید توسل حسین چھپوا کر دفتر کاکوری اخبار' مولوی محلہ (لال املی) کاکوری سے شائع کیا۔